GUMAN
گمان
VOL 7, ISSUE 3, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

(Evolution of Urdu Language: An Evidence from Literary Review - Research and Critical Analysis)

اردو زبان کا ارتقا: ادبی ماخذ سے چند شواہد (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)

Dr. Asad Mahmood Khan
Novelist and Short story Writer,
Aziz Bhatti Colony, Lahore

SCAN ME

Abstract
This dissertation examines the historical evolution of Urdu, starting from its roots and influencing as a separate and unique language. This study seeks to gain a thorough understanding of the development of Urdu and its importance in the Indian subcontinent by carefully analyzing historical and linguistic facts. The ramifications of our findings extend to language and cultural studies, enriching our grasp of the intricate history and cultural heritage of the region. This study paper provides a comprehensive analysis of the social and linguistic evolution of Urdu, from its inception to its present state. It aims to encompass all facets of the language. We have also considered the viewpoints of language development experts.

Key Words: *Historical Evolution, Roots and Influence, Social and Linguistic, Development.*

GUMAN
گمان
VOL 7, ISSUE 3, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

ملخص:

یہ مقالہ اردو زبان وبیان کے تاریخی ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے ماخذ اور اثرات کی بازیافت کرتا ہے، جو مجموعی طور پر اردو کے آغاز وارتقا کی منازل سے حاصل ہونے والی لسانی شناخت تک کا سفر طے کرتا ہے۔ اس مطالعہ میں تاریخی اور لسانی حقائق کا بغور تجزیہ کرتے ہوئے برصغیر پاک وہند میں اردو کی ترقی اور اس کی اہمیت کے بارے میں گہرا ادراک حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون سے حاصل نتائج کے اثرات زبان وبیان کے آغاز وارتقاء اور ثقافتی مطالعات تک پھیلے ہوئے ہیں، جو خطے کی پیچیدہ تاریخ اور ثقافتی ورثے کے بارے میں ہماری بازیافت کو تقویت بخشتے ہیں۔ یہ مطالعاتی مقالہ اردو کے سماجی اور لسانی ارتقا کے آغاز سے لے کر اس کی موجودہ صورت تک کا جامع تجزیہ فراہم کرتا ہے جس کا مقصد اردو زبان کے تمام پہلوؤں کو شامل کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں ماہر لسانیات کے متنوع نقطہ نظر کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: تاریخی ارتقا، جڑیں اور اثر، سماجی اور لسانی، ترقی

اردو زبان کا ارتقا: ادبی ماخذ سے چند شواہد (تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

زبان کیا ہے اور زبان کی تعریف وتاریخ، ادبی معاونت میں کیا حیثیت رکھتی ہے!!! ایک طرف زبان دراصل نطق کا آلہ یا منھ کا وہ اندرونی حصہ ہے جو ذائقہ تک رسائی میں مدد ومعاون ہوتا ہے جب کہ دوسری جانب باہمی تکلم، رابطے اور اظہاریے کا وہ ذریعہ جو خیالات واحساسات اور جذبات و کیفیات کی صوتی ترجمانی کی صورت کرتا ہے۔ مجموعی طور پر بات چیت، باہمی کلام یا بیان کی صورت؛ بولی، بول چال یا بحث؛ لسان، روز مرّہ یا محاورہ؛ قول، اقرار یا وعدہ؛ بیانیہ انداز، گفتگو یا بات کرنے کا طریق جیسے سب الفاظ زبان کے زمرے میں آتے ہیں۔ اردو لغات میں زبان کے معنی انہی پیش کردہ تناظرات میں بیان کیے گئے ہیں جیسے اظہر اللغات میں جیبھ، للو، بھاکا، عہد، پیمان، لسان، بولی؛ فیروز اللغات فارسی میں جیبھ، بول چال اور بول چال کا ذریعہ جب کہ فیروز اللغات اردو میں بیان کردہ معنوں کے علاوہ انسان وحیوان کے منہ میں چیزوں کا ذائقہ معلوم کرنے کا عضو یا بعض آوازوں کا منبع بھی درج ہیں۔ انگریزی ڈکشنری میریم ویبسٹر الفاظ، ان کا تلفظ، اور ان کو یکجا کرنے کے طریقے جو کمیونٹی کے ذریعہ استعمال اور سمجھے جاتے ہیں۔ آکسفورڈ ایڈوانس لرنرز ڈکشنری میں تقریر اور تحریر میں مواصلات کا نظام جو کسی خاص ملک یا علاقے کے لوگ استعمال کرتے ہیں، یا زبان مواصلات کا ایک ایسا نظام ہے جس میں آوازوں اور تحریری علامتوں کا مجموعہ ہوتا ہے جو کسی خاص ملک یا علاقے کے لوگ بات کرنے یا لکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جب کہ انگریزی ڈکشنری میکملن میں لسانیات زبان کا مطالعہ اور لوگ اسے کیسے استعمال کرتے ہیں یا بولے ہوئے یا تحریری الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے انسانی مواصلات کا طریقہ درج ہیں۔

خلیل صدیقی (1) نے زبان کی جو تصویر بنائی، اس کی تفہیم یہ بنتی ہے:

"زبان کوئی طے شدہ معاملہ کسی تیار شے کا نام نہیں ہے بلکہ زبان میں شامل ہر لفظ، یاالفاظ کی تشکیل، اور اس میں شامل سب الفاظ کی موجودہ شکل و صورت گوناگوں تبدیلیوں کا حاصل ہے۔"

زبان کا بیان کرتے ہوئے ایڈورڈ ہال(2)لکھتا ہے:

"زبان خیالات اور احساسات کے اظہار کا ایک ایسا نظام ہے جو قواعد وضوابط، علامتوں اور علامات پر مشتمل ہوتا ہے۔"

اظہار اور رابطے کا مضبوط حوالہ گردانتے ہوئے نوم چومسکی(3)لکھتا ہے:

"زبان رابطے کا ایک طاقتور ذریعہ ہے جو افراد کو دوسروں کے سامنے اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرنے کی سہولت دیتی ہے۔"

اردو میں لفظ زبان بہ طور اسم فارسی سے مستعار لیا گیا ہے۔اس کے ذریعے انسان تکلم یا تحریر کی صورت میں اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ایبنگ ہاؤس کے مطابق زبان روایتی علامتوں کا ایک نظام ہے جو کسی بھی وقت اختیاری طور پر مسلمات کے تحت وضع کیا جاتا ہے۔ایف ڈی ساسر کے مطابق زبان خیالات اور افکار کا اظہار کرنے والی علامتوں کا نام ہے۔اوٹو جیسپرسن کے مطابق زبان انسانی سرگرمی اور عمل ہے جس کا مقصد خیالات وجذبات واظہار ہے۔پروفیسر خلیل صدیقی کے مطابق زبان انسان کی تکلمی یا نطقی آوازوں سے تشکیل پاتی ہے، علامتی حیثیت رکھتی ہے، اختیاری اور متفق علیہ ہوتی ہے، یہ ایک نظام ہے اور ابلاغ کا ذریعہ ہے۔جرمن مفکر ہرڈر کے مطابق زبانوں کی تخلیق ربانی نہیں ہوتی، یہ انسانوں کی اپنی وضع کی ہوئی تخلیق ہے۔یعنی زبان انسان کا تخلیقی عمل ہے۔ماہر نفسیات ونٹ کے مطابق زبان کا آغاز محض اتفاق ہے۔رڈالف ایسلر کے مطابق زبانیں(1) دینیاتی(2)اختراعی اور(3)نفسیاتی نسبی بنیاد پر وجود میں آتی ہیں۔تاہم زبان کی ابتدائی صورت، خلیل صدیقی کے مطابق، انسانی ذہن کا کرشمہ ہے۔

انسانی زبان کے لیے ضروری ہے کہ اس کی خاص علامتی حیثیت ہو اور ایک خاص انسانی گروہ میں تکلم وابلاغ کے لیے مستعمل ہو۔ماہرین لسانیات کے مطابق کسی بھی زبان کے لیے اس کا صرفی، نحوی، صوتی اور معنیاتی نظام کا ہونا ضروری ہے۔

مولوی عبدالحق(4)لکھتے ہیں:

"جس طرح ہر شے کا ظاہر اور باطن ہوتا ہے۔اسی طرح الفاظ کا بھی ظاہر و باطن ہوتا ہے ظاہر وہ ہے جس کا تعلق صرف سے ہے یعنی اس میں صرف لفظ کی صورت کی تبدیلی وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے اور لفظ کا باتیں اس کا مفہوم اور معنی ہے اس کی بحث نہو میں ہوتی ہے۔اس میں زیادہ تر بحث لفظ کے باطن یعنی اس کے معنی کے لحاظ سے ہوتی ہے۔"

فرڈینینڈ ڈی سوسر(5)رقمطراز ہے:

"زبان ایک شکل ہے مادہ نہیں اور اس کی وحدت نحو، ساخت اور عناصر کے درمیان باہمی تعلق کے نظام میں مضمر ہے۔"

ماہرین لسانیات کا دعویٰ ہے کہ مکمل طور پر فعال زبان میں ایک جامع لغوی، نحوی، صوتیاتی اور معنوی نظام شامل ہونا چاہیے۔ یہ چار اجزاء کسی بھی زبان کی ساخت اور فعالیت کے لیے لازم وملزوم ہوتے ہیں جو باہمی تعلق، رابطے اور افہام و تفہیم کے عمل میں منفرد کردار ادا کرتے ہیں۔ اردو زبان اپنے بھرپور ادبی اور ثقافتی ورثے کے ساتھ ان لسانی نظاموں کی عمدہ مثال ہے، جو اس کے تاریخی ارتقاء اور عصری مطابقت کی عکاسی کرتی ہے۔ ایک جامع اور پر فعال زبان میں سب سے پہلے، کسی زبان کا لغوی نظام کا مضبوط ہونا ہے جو عام طور پر اس زبان کا ذخیرہ الفاظ کہلاتا ہے۔ الفاظ، معنی کی بنیادی اکائیاں ہیں جو ایک معنویت سے بھرپور زبان بولنے والوں کو خیالات، جذبات اور تصورات کا اظہار کرنے کی سہولت دیتی ہے۔

ماہر لسانیات ڈیوڈ کرسٹل (6) لکھتا ہے:

"لفظیات ایک زبان کا عروج ہے جو اس کی کثرت اور تنوع کا ذخیرہ ہے۔"

اردو کی لغت عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت اثرات کا ایک دلچسپ امتزاج ہے، جو اس کے تاریخی اور ثقافتی تقاطع کی عکاسی کرتی ہے۔ الفاظ میں یہ تنوع اردو بولنے والوں کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ پیچیدہ باریکیوں اور اظہار کی ایک وسیع رینج کو پہنچا سکے، جس سے زبان شاعرانہ طور پر بھرپور اور اظہار خیال کرتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ زبان کی لغت کی توسیع ثقافتی ارتقاء، تکنیکی ترقی، اور سماجی تبدیلیوں کی عکاسی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر، نئی ٹیکنالوجیز کا تعارف اکثر نئے الفاظ کی تخلیق کی ضرورت کرتا ہے۔ ایک مضبوط اور متحرک لغوی نظام کے بغیر، ایک زبان اپنے بولنے والوں کے لیے تیار اور متعلقہ رہنے کے لیے جدوجہد کرے گی۔

ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین (7) رقمطراز ہیں:

"زبان کے زیادہ استعمال سے اس میں باریکیاں پیدا ہونے لگتی ہیں ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ایک سے زیادہ الفاظ کا چلن زبان میں عام ہوتا ہے یعنی ایک ہی مفہوم کے لیے کئی الفاظ کی موجودگی اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ زبان نے وسعت وہمہ گیری آگئی ہے۔"

نحوی نظام، یا نحو، ان قواعد سے متعلق ہے جو جملوں کی ساخت کو کنٹرول کرتے ہیں۔ نحو یہ بتاتا ہے کہ الفاظ کیسے مل کر جملہ اور جملے بناتے ہیں۔ نحوی نظام ایک ایسا مربوط طریقہ کار اور سلیقہ فراہم کرتا ہے جو جملے میں وضاحت اور ہم آہنگی کو یقینی بناتا ہے۔ اردو نحو، اپنی قبول روش کے سبب قدرے لسانی لچک اور گنجائش کی حامل ہے جو لفظی تعاملیت کی صلاحیت رکھتی ہے اور اسے دوسری زبانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اردو میں جملے کا مخصوص ڈھانچہ "فاعل۔مفعول۔فعل" یعنی Subject-Object-Verb (SOV) ہے جب کہ انگریزی میں عام طور پر "فاعل-فعل۔مفعول" یعنی Subject-verb-Object (SVO) کی ساخت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی زبان بشمول اردو جملوں کے معنی اور باریکیوں کو سمجھنے کے لیے ان نحوی قواعد کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ یہی وہ بنایدی نظام بناتا ہے جس کے ذریعے ایک جملے میں الفاظ کے

درمیان باہمی تعلق، مضمون اور معنویت، کردار اور تعاملیت اور ترمیم شدہ سے ترمیم کرنے والے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ بھی طے ہے کہ مؤثر کلام اور ترسیل کلام کے لیے ایک متعین نحوی ڈھانچہ ضروری ہے جو لفظی ابہام اور غلط تشریح کو روکنے میں مدد کرتا ہے۔

اردو کی قبولی روش کے بارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری(8) لکھتے ہیں:

"اردو کا صرفی حصہ آریائی ہے اور نحوی حصہ دراڑ یا منڈا۔ اردو اپنی فطرت سے بڑی ہی ملنسار، اہلی گھلی اور ہر زبان سے گھل مل کر شیر و شکر ہو جانے والی زبان ہے۔"

زبان کا تیسرا اہم جزو صوتیات یعنی آوازوں سے متعلق ہے جو یہ تعین کرنے میں معاونت کرتا ہے کہ آوازیں کس طرح پیدا ہوتی ہیں، ان کی ترسیل یا منتقلی کیسے ہوتی ہے اور یہ کیوں کر سمجھی جاتی ہیں۔ ہر زبان میں صوتیات کا ایک منفرد اور مکمل نظام ہوتا ہے جو آواز کی سب سے چھوٹی اکائی اور معنی میں فرق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اردو کا ایک الگ صوتیاتی نظام ہے جس کی خصوصیت اس کی مدھر لہجہ اور تال ہے جو اردو زبان میں شامل ایسی آوازوں کی شمولیت کے سبب ہے جو بہت سی دوسری زبانوں خصوصاً عربی، فارسی اور دیگر میں نایاب یا متروک ہو چکے ہیں۔ کسی زبان کا صوتیاتی نظام، اس میں شامل آوازوں کے باہمی امتزاج کی وضاحت کرتا ہے، جو کہ بولی جانے والی بات چیت کے لیے اہم ہیں۔ مناسب تلفظ، تناؤ، لہجہ، اور تال سبھی صوتیات کے تحت آتے ہیں، جو باہمی کلام اور پیغام کو پہنچانے اور سمجھنے کے طریقے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مربوط صوتیاتی نظام کے بغیر، بولی جانے والی زبان میں مؤثر مواصلت کے لیے درکار درستگی کی کمی ہو گی، جس سے غلط فہمیاں اور الجھنیں پیدا ہوں گی۔

پروفیسر اقتدار حسین خاں(9) لکھتے ہیں:

"زبان کی آوازوں کے سائنٹیفک ڈھنگ اور منظم طور سے مطالعے کو صوتیات کہتے ہیں جو زبان کی آوازوں اور ان کی مخارج کا مطالعہ کرتی ہے اور ان میں اعضائے تکلم کی حرکت اور مقام کا مطالعہ بھی شامل ہے۔"

معنوی نظام، الفاظ اور جملوں کے معانی سے متعلق ہے جو اس بات کا تعین کرتا ہے کہ کس طرح معنی کی تعمیر، تشریح اور پہنچایا جاتا ہے۔ یہ اشارے کرنے والوں کے درمیان تعلقات سے متعلق ہے۔ الفاظ، جملے، علامات، اور علامات۔ اور وہ کس چیز کے لئے کھڑے ہیں یا نمائندگی کرتے ہیں۔ اردو میں، معنوی نظام اپنے ثقافتی اور تاریخی تناظر سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ زبان کی بھرپور ادبی روایت، بشمول شاعری، غزلیں، اور نثر، اکثر استعاراتی اور علامتی معانی استعمال کرتی ہیں جن کے لیے اس کی معنوی باریکیوں کی گہری سمجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری جانب معنوی نظام دراصل لسانی تاثرات اور ان کے حقیقی دنیا کے حوالہ جات یا تجریدی تصورات کے درمیان فرق کو ختم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اچھی طرح سے تیار کردہ معنوی نظام بولنے والوں کو پیچیدہ خیالات، جذبات اور باریکیوں کو مؤثر طریقے سے پہنچانے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔

معنوی نظام، کی صورت واضح کرتے ہوئے رے جیکنڈ آف(10) رقمطراز ہے:

"معنوی نظام، کا تعلق لسانی شکلوں اور ان پر ڈالی جانے والی تشریحات کے درمیان منظم تعلق سے ہے۔"

ولیم لائکن (11) لکھتا ہے:

"معنوی نظام، الفاظ اور جملوں میں معنی کی نوعیت اور اصولوں، اس کی تشریح، اور مواصلات میں اس کے استعمال کی تحقیقات کرتا ہے۔"

ان اجزاء میں سے کسی کی غیر موجودگی یا کم ترقی زبان کی تاثیر کو نمایاں طور پر متاثر کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، ایک بھرپور ذخیرہ الفاظ کو ترتیب دینے کے لیے نحوی اصولوں کے بغیر بے کار ہے، بالکل اسی طرح جیسے الفاظ کے معانی کو سمجھے بغیر واضح تلفظ بے معنی ہے۔ یہ نظام اجتماعی طور پر ہمیں لسانی ڈھانچے کی پیچیدہ خوبصورتی کو اجاگر کرتے ہوئے خیالات کا اظہار کرنے، علم کا اشتراک کرنے اور دوسروں کے ساتھ جڑنے کے قابل بناتے ہیں۔ اردو کا معاملہ مخصوص لسانی اور ثقافتی تناظر میں تعاملیت کی ایک عمدہ مثال ہے جو زبان کے تنوع اور فروغ میں اہمیت کا حامل ہے۔

مولوی عبدالحق (12) لکھتے ہیں:

"جملہ لفظوں سے بنتا ہے اور لفظ کا صحیح مفہوم اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ جملے میں آتا ہے یوں جملہ کہ دو حصے ہو جاتے ہیں: ایک میں الفاظ کی تقسیم اور باہمی جڑت سے جو تغیر و تبدل ہوتا ہے یا جو نئی صورت پیدا ہوتی ہے؛ دوسرا جملے میں لفظوں کے ایک دوسرے سے اور جملوں کی باہمی تعلق سے بحث کرتا ہے۔"

زبان، ایک تخلیقی کینوس جیسی ہے جس پر ہم اپنے خیالات، جذبات اور تجربات کو صوتی دھاگوں کی مدد سے تصویر کرتے ہیں۔ یہ اس راگ کی مانند ہے جو ہماری اندرونی دنیا کو بیرونی حقیقت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہاں ہر لفظ کے ساتھ، ہم معنی کی ایک صورت بُنتے ہیں، اور تفہیم کی ایک کیفیت روح کے اندر گونجتی ہے۔ زبان دراصل ایک ماہر فنکار کی طرح، زبان رنگوں، بناوٹوں اور تالوں کو مہارت کے ساتھ ملاتی ہے تاکہ جذبات کو ابھارنے، خیالات کا اظہار کرنے اور جوڑ بنانے کے لیے تعاملیت کارگر دکھائی دے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جیسے جیسے ہم بولتے ہیں، ہمارے الفاظ سامعین کے ذہن کے کینوس پر نقش بنتے جاتے ہیں جو ایک متحرک تصویر جنم دیتے ہیں جو انہیں نئی دنیاؤں، متنوع سمتوں اور تازہ جہتوں تک لے جاتے ہیں۔ ہماری آواز کا نرم لہجہ، باریک بینی، اور سوچے سمجھے وقفے، سبھی مواصلات کا ایک شاہکار تخلیق کرنے کی کوشش ہوتے ہیں۔ ٹھیک کسی مجسمہ ساز کی طرح ایک غیر مجسم سنگ مرمر پر چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے، زبان مشترکہ فہم کی پوشیدہ خوبصورتی کو ظاہر کرتی ہے۔ زبان کے دائرے میں تشبیہ و استعارات اور حسن ترتیب، وہ بنیادی جڑت بندیاں ہیں جو تخیلاتی تعامل کو بھڑکاتی اور خیال کے تاریک گوشوں کو خواب اور تعبیر سے روشن کرتی ہیں۔

اردو زبان کیسے وجود میں آئی اور کیسے تاریخ کا کشٹ کاٹتی ہُوئی ارتقائی منازل طے کیں! اس سوال کا جواب تلاشنے کے لیے ہمیں اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے متنوع نظریات کی چھان بین کرنا پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کی ابتداء زبانوں کے چار بڑے خاندانوں: ہند یورپی (ہند آریائی)، دراوڑی، آسٹرو ایشیاٹک اور چینی تبتی میں سے اول الذکر خاندان ہند یورپی کی ایک ذیلی شاخ ہند آریائی سے ملتی ہے۔ ہندوستان میں مروجہ

GUMAN گمان
VOL 7, ISSUE 3, 2024
E(ISSN) 2709-4162, P(ISSN) 2709-4154
https://guman.com.pk/index.php/GUMAN

زبانوں کے آغاز کو آریا خاندان کی ہندوستان میں آمد سے جوڑا جاتا ہے جس نے لگ بھگ 1500 قبل مسیح میں اس سرزمین پر اپنے قدم جمائے ہیں۔ آریاؤں کی ہندوستان میں آمد سے قبل ایک طویل عرصہ مشرقی ایران میں اپنا اثر ورسوخ قائم کر چکے تھے جو قریب 2000 قبل مسیح کا زمانہ بنتا ہے۔ آریا کے مشرقی ایران میں قیام کے دوران ایک مشترکہ مقامی زبان، ہندایرانی، تشکیل پا چکی تھی جو یقیناً جدید فارسی سے مختلف یا اس کی ابتدائی صورت کا حصہ رہی ہوگی۔ اگرچہ آریاؤں کی ہندوستان میں آمد قدرے بعد میں ہوئی لیکن، ہندایرانی کو ہندوستان کی قدیم ترین صورت یا ماں زبان کہا جا سکتا ہے جس نے بعد ازاں کئی دیگر مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی جنم دیا ہے۔ یہی وجہ کہ ہندوستان کے قدیم تحریری، نسخے: اتھر وید، یجر وید، سام وید اور رگ وید، اسی قدیم صورت کی ابتدائی شکل میں لکھے گئے تھے۔ اگرچہ ہندوستان میں آریاؤں کی دراندازی سے قبل کی مقامی زبانوں کا تعلق ہند یورپی خاندان سے جوڑا جاتا ہے جو ہندوستان کے علاوہ یورپ، امریکہ، افریقہ اور آسٹریلیا میں بولی جانے والی زبانوں کا ایک مشترکہ خاندان تصور کیا جاتا ہے اور زبانوں کی گروہی تقسیم میں سب سے بڑا خاندان بھی مانا جاتا ہے۔ یوں کئی بڑی اور اہم زبانیں جن میں، سنسکرت، لاطینی، انگریزی، پنجابی، بنگالی، ہندی اور اردو جیسی زبانوں کا تعلق اسی خاندان سے نکلتا ہے۔

اردو زبان کا تعلق بھی بنیادی طور پر زبانوں کے اسی خاندان، ہند یورپی، سے نکلتا ہے جس میں کئی زبانوں کے الفاظ کی شمولیت ابتدائی طور پر سے ہی مل جاتی ہے لیکن مجموعی طور پر عرب، افغان، ترکیہ اور ہندوستان کی گئی مقامی زبانوں کا اختلاط اس کی ابتدائی شکل سنوارنے میں پیش پیش دکھائی دیتا ہے۔ ہندوستان کے مقامی لب ولہجے اور زبان وبیان جنہوں نے اردو کی ابتدائی صورت میں تعامل کیا، ان میں زیادہ متحرک مقامی نقوش ہندوی یا ہندی، دہلوی، گجری، دکنی ریختی، ہندستانی اور اردو کی صورت میں 600 عیسوی سے تک بھگ 1800 عیسوی تک اپنی ابتدائی مشکل لے چکے تھے۔ اگرچہ لفظ "اردو" کا استعمال اٹھاویں صدی کے آخر تک ہندوستان میں نہیں ملتا البتہ شاہ جہاں کے زمانے میں اس کے مستعمل ہونے کے شواہد مل جاتے ہیں۔ "اردو" لفظ کا تعلق ترکی، فارسی اور سندھی زبانوں سے جوڑا جاتا ہے جہاں بعض لسانی ماہرین کے نزدیک لفظ "اردو" کی بنیادی زبان ترکی بنتی ہے جب کہ بعض ماہرین اسے فارسی زبان سے ماخذ خیال کرتے ہیں، البتہ ڈاکٹر سلیم اختر کے نزدیک یہ لفظ سندھی میں بھی مستعمل رہا ہے جس کے معنی ذخیرہ یا ڈھیر کے ہیں۔ دیگر معروضات میں سکنیڈے نوین میں "ارد" (Urd) یا "ارتھ" (Urth) بھی بامعنی مجموعہ، مجمع یا ڈھیر استعمال ہوتا ہے جب کہ آریائی زبان کے اندر لفظ "ارد" کے معنی معاشرہ یا معاشرت نکلتے ہیں۔ اسی طرح لاطینی میں "ہورد" (Horde) سے مراد لشکر یا خانہ بدوش لیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں "اردو" کی شروعات یا آغاز کے متعلق مصحفی کی شاعری میں شہر یاد ہلی کے لیے باندھا ہے بعد ازاں انشاء نے اپنی تصنیف "دریائے لطافت" میں لفظ اردو کو دہلی شہر کے لیے برتا جب کہ مغلیہ بادشاہ شاہ عالم نے "عجائب القصص میں "ہندی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ خسروؔ، میرؔ اور غالبؔ سے "ریختہ" جب کہ مومنؔ نے اسے "اردو معلیٰ" اور "اردو" سے تعبیر کیا ہے۔

اردو زبان کے آغاز وارتقاء کے متعلق مختلف نظریات پیش کیے گئے ،ان نظریات کی دو بنیادی زمروں میں رکھا جاسکتا ہے: اول، زبان کی پیدائش اور انسانی پیدائش کا معاملہ ایک سا گردانتے اور دو زبانوں کے باہمی اشتراک سے ایک نئی زبان کی تجسیم کو درست جانتے ہیں۔ دوم، زبان کی پیدائش خالص لسانی اصولوں پر قائم کرتے ہیں جن کی نظر میں زبان کی صرفی و نحوی تجسیم قابل قدر حیثیت کی حامل ہے۔ اول الذکر ذخیرہ الفاظ کو زبان کی پیدائش اور ارتقاء کا ضامن سمجھتے ہیں جب کہ بعد الذکر لسانیائی اصولوں پر باہمی اشتراک یا اختلاط سے تہی دامن کرتے ہیں۔

اردو زبان کے آغاز وارتقا کے حوالے سے مجموعی احاطہ کرتے ہوئے گیان چند جین (13) رقمطراز ہیں:

"اُردو کے مسئلے پر غور کرنے والوں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک تو وہ بزرگ ہیں جو لسانیات کا ادرک نہیں رکھتے جب کہ دوسرے وہ اہل نظر ہیں جو تاریخی لسانیات پر نظر رکھتے ہیں۔"

مذکورہ تحقیقی مضمون کے لیے اردو زبان کے ابتداء کے حوالے سے پیش کردہ نظریات کو ادبی ماخذ کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش بنیادی محرک ہے لہٰذا زمانی تربیت کا خیال کرتے ہوئے، ان نظریات کی اساس اور ان پر کی جانے والی تنقید کی اساس کو جانچنے اور مجموعی تاثیر حاصل کرنے کی عملی صورت کی گئی ہے۔

زبان کے ارتقا کے مسئلے پر بن جانے والی صورت کا بیان کرتے ہوئے خورشید حمر اصدیقی (14) لکھتے ہیں:

"اردو زبان کے آغاز کے متعلق بہت سے نظریے پیش کیے گئے ہیں لیکن ابھی تک اردو کے آغاز کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا بلکہ یہ اس قدر الجھ گیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ لاینحل ہے جس کا حل ممکن نہیں۔"

میر امن نے اپنی تصنیف "باغ و بہار" (1803ء) میں مغلیہ شہشاہ اکبر کے زمانے میں لوگوں کے درمیان تجارتی گفتگو اور باہمی تکلم کے لئے تشکیل پانے والی باہمی مشترکہ زبانی صورت کو "اردو" سے منسوب کرتے ہیں جو بنیادی طور پر مختلف زبانوں کے اختلاط کا حاصل یعنی زبانوں کی کھچڑی یا ملواں ہونے کا نظریہ بنتی ہے۔ اگرچہ کچھ ایسی ہی صورت کا اظہار امام صہبائی بھی کرتے ہیں جو اردو کی ہندی اور فارسی الفاظ کی باہمی شراکت داری کا حاصل گردانتے ہیں۔ مذکورہ نظریہ ماہرین لسانیات کی نظر میں قبولیت کا درجہ نہیں رکھتا کہ زبان و بیان کے بنیادی اصولوں میں زبان اپنی اصلیت، ساخت اور بنیاد پر شناخت حاصل کرتی ہے جو لسانی اصولوں (صرفی بخوبی) اور قواعد و ضوابط سے مشروط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محض ذخیرہ الفاظ کو زبان کی شناخت سے جوڑنا قبولیت حاصل نہیں کرتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی تصنیف "آب حیات" (1880ء) میں "اردو" کو برج بھاشا سے ماخذ زبان لکھا اور توثیق میں برج بھاشا کے خالص ہندوستانی زبان ہونے کا نظریہ بھی پیش کیا۔ اگرچہ اس نظریہ کی ابتدائی صورت ہندو آریائی کے ماہر روڈولف ہیورنلے نے پیش کی تھی جب کہ ابتدائی تذکرہ سید شمس اللہ قادری نے رسالہ "تاج اردو" کے ایک قدیمی نمبر میں کیا ہے۔ مذکورہ نظریہ اس بنیاد پر قابل اعتراض ہوا کر ماہرین لسانیات

کے مطابق آزادؔ، لسانی اصول و ضوابط سے شناسا نہ تھے اور نہ ہی دہلی اور اس کے نواح میں بولی جانے والی زبانوں کے اختلافات سے آگاہی رکھتے تھے۔ انہوں نے محض روایت کا سہارا لے کر اپنا نکتہ نظر پیش کیا اور یہی وجہ ہے کہ اپنے موقف کو دلیل یا لسانی شواہد سے مضبوط نہیں کیا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تصنیف "دکن میں اردو" (1923ء) میں اردو کی ابتداء کو دکن سے منسوب کیا ہے اور اسی تناظر میں اردو کی ابتدائی شکل و صورت سنوارنے میں دکن کی خدمات پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔ اس موقف پر بنیادی اعتراض نظریے کی اساس پر ہے جو خالص تاریخی واقعات کو بنیاد بنا کر اردو کے آغاز کو دکن سے منسوب کرتا ہے کیوں کہ مسلمان ہندوستان میں سب سے پہلے سندھ کے راستے داخل ہوئے۔ اب اگر سندھ سے ابتداء کا نکتہ درست نہیں تو دکن کا نکتہ نظر بھی اعتراض کی زد میں آجاتا ہے۔

سید سلمان ندوی میں اپنی تصنیف "نقوش سلیمانی" (1939ء) میں مسلمانوں اور مقامی لوگوں کی زبان کے اشتراک اور باہمی اختلاط کی صورت کا حاصل اردو زبان کو گردانتے ہیں جس کی بنیاد ہندستان میں مسلمانوں کی سندھ کے راستے آمد سے شروع ہوتی ہے یعنی سندھ میں مسلمانوں کی آمد کے بعد عربی اور مقامی زبانوں کے اختلاط سے اردو کا آغاز ہوا۔ تاریخی نکتہ نظر سے اس نظرے کو تقویت ملتی ہے لیکن عربی اور مقامی زبانوں کے صرفی و نحوی قواعد و ضوابط کے درمیان باہمی اشتراک اور اختلاط کی صورت، ماہرین لسانیات کے لیے ایک سوالیہ نشان ہے جب کہ دوسری جانب سید سلیمان ندوی اپنے ہی نظریے کے مقابل ملتانی اور پنجابی زبانوں کی ترقی یافتہ صورت کو بھی اردو کا ابتدائی ڈھانچہ خیال کرتے ہیں۔

پروفیسر سنتیسی کمار چٹرجی جو بنیادی طور پر بنگالی زبان کی تاریخ پر ماہر مانے جاتے ہیں لیکن ان کے "ورنیکولر سوسائٹی گجرات" (1940ء) کے لیکچرز جو انہوں نے "ہند آریائی" زبانوں اور خصوصاً ہندی کے آغاز و ارتقا کے حوالے سے پیش کیے اور بعد ازاں "ہند آریا ور ہندی" (1944ء) کے زیر عنوان کتابی صورت میں شائع کیے ہیں، میں اس نکتہ نظر کو پیش کیا کہ اردو دراصل مغربی اَپ بھرنش، شمالی ہند کے نواح کی مشترکہ زبان تھی۔ مذکورہ نکتہ نظر پر بنیادی اعتراض مقامی زبانوں کی غیر ضروری تفصیلات اور الجھاؤ ہے جو کئی صورتوں میں باہم مقابل آکر اپنے ہی نکتہ نظر کے خلاف دکھائی دینے لگتا ہے۔

حافظ محمود شیرانی نے اپنی نصف "پنجاب میں اردو" (1941ء) میں مسلم حکمرانوں کی ہندوستان میں آمد کی پنجاب سے منسوب کرتے ہوئے بیرونی زبانوں عربی، فارسی اور ترکی کی مقامی زبان پنجابی سے اشتراک کو اردو زبان کی شروعات سے منسوب کرتے ہیں۔ اگرچہ اس نکتہ نظر کو ان کے علاوہ شیر علی خان سرخوش نے "اعجاز سخن" (1923ء) اور سید محی الدین قادری زور نے "ہندوستانی لسانیات" (1932ء) میں بھی ذکر کیا ہے۔ مذکورہ نظریے پر سب سے نمایاں اعتراض، ماہرین لسانیات کے نزدیک پنجابی لب لہجے اور زبان و بیان کی وہ خصوصیات میں جن کا ذکر حافظ محمود شیرانی نے کیا ہے، وہ دہلی اور نواح میں بولی جانے والی مقامی زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں البتہ تاریخی شواہد اس نظریے کو مضبوط اساس مہیا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی تصنف "اردو زبان کا ارتقاء"(1956ء) میں اردو زبان کے آغاز کو "پالی" زبان سے منسوب کرتے ہیں لیکن بعد ازاں خود ہی اپنے نکتہ نظر سے رجوع کرتے ہوئے "داستان زبان اردو"(1960ء) میں اردو کے آغاز کو کھڑی بولی سے منسوب کرتے ہیں جسے وہ ہندوستانی بھی کہتے ہیں۔ان کے نزدیک اردو اس کھڑی بولی کی ترقی یافتہ صورت ہے جو دلی اور میرٹھ کے نوح میں بولی جاتی تھی۔مذکورہ نظریے پر نمایاں اعتراض ماہرین لسانیات اور تاریخ کو یہ ہے کہ اگر کھڑی بولی پنجابی کا حاصل نہیں کہ اردو اس کا حاصل کیسے ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی تصنف "ہندوستانی لسانیات"(1960ء) میں اس نکتہ نظر پر بحث کی ہے کہ بارہویں صدی عیسوی میں بولی جانے والی پنجاب زبان کا حاصل اردو زبان ہے۔اس نکتہ نظر پر بنیادی اعتراض محی الدین قادری کا علمی اختلاف کی بجائے ذاتی نوعیت اختیار کر جانا ہے جس کی وجہ ان کا شدید رد عمل ماہرین لسانیات اور خصوصاً ڈاکٹر گریریسن کی تحقیقات پر تحفظات سے جنم لیتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی تصنیف "مقدمہ زبان اردو"(1966ء) میں اردو کے آغاز کو دہلی سے منسوب کیا ہے۔ان کی نظر میں دہلی کے نواح میں بنیادی طور پر چار مقامی بولیوں کا رواج تھا جن میں کھڑی، ہریانی، میواتی اور برج بھاشا شامل تھیں۔انہی چاروں کے اشتراک اور اختلاط کا حاصل اردو کو جانتے ہیں۔اس نکتہ نظر میں بنیادی اعتراض ہریانوی کے پنجابی سے قدیم ہونے پر ہے جو اساسی ابہام کو تقویت پہنچاتا ہے۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اپنی تصنف "ملتانی اور اردو سے تعلق"(1967ء) میں اردو کی شروعات کو ملتان سے منسوب کرتے ہیں۔اس پر نمایاں اعتراض اس کی لسانی تشکیل کا ادھورا بیان اور اردو کا ملتان سے دہلی کی سمت سفر کا جواز مہیا نہ کرنا ہے جو شواہد اور دلائل کی کجی کا شکار ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد بخاری، اردو کو ہند آریائی خاندان سے نہیں بلکہ دراوڑی خاندان سے تعلق نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اردو کو دراصل کھڑی بولی کا حاصل مانتے ہیں جب کہ اردو اور ہندی اسی کھڑی بولی کے دو الگ روپ ہیں۔مذکورہ نکتہ نظر پر بنیادی اعتراض لسانی خاندانوں کی تقسیم و تربیت سے یکسر الگ خیال ہے جو دلائل اور شوائد کے بغیر تقویت حاصل نہیں کرتا ہے۔

مذکورہ نظریہ پر کڑی تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین(15) لکھتے ہیں:

"ماہر لسانیات ڈاکٹر سہیل بخاری، انوکھے غیر سنجیدہ اور ایجاد بندہ قسم کے لسانیاتی نظریات گھڑنے کے ماہر ہیں۔"

عین الحق فرید کوٹی (اصل نام: فضل الٰہی) اپنی تصنیف " اردو زبان کی قدیم تاریخ"(1979ء)، میں اردو کو دراوڑی زبان سے منسوب کرتے ہیں اور اپنے نکتہ نظر میں پاکستان کی بیشتر زبانوں کا آغاز اسی زبان سے تلاش کرنے پر زور دیا ہے۔مذکورہ نکتہ نظر پر بنیادی اعتراض ہڑپائی تہذیب کا دراوڑی سے تعلق دکھایا جاتا ہے لیکن معلومہ تاریخ میں اس کا براراست تعلق وادی سندھ سے نہیں ملتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین، جدید ماہر لسانیات نے اپنی تصنف "لسانی مطالعے"(1979ء) میں اردو کی کھڑی بولی سے منسوب کیا ہے۔ان کی نظر میں اردو نبدی اور کھڑی بولی کے بنیادی الفاظ باہم ایک دکھائی دیتے ہیں جو اس نظریے کو تقویت دینے کے لیے دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔مذکورہ

نکتہ نظر جدید ماہرین لسانیات کے نزدیک قبولیت حاصل کرتے ہیں ناکام دکھائی دیتا ہے جس کی بنیادی وجہ تاریخیت کے تناظر میں الجھاؤ اور لسانی ربط کا باہم ٹکراؤ ہے جو اس کی اساس کو کمزور کرتا ہے۔

مجموعی طور پر پیش کیے جانے والی ادبی ماخذ کے شواہد اس بات پر متفق دکھائی دیتے ہیں کہ تاریخی شواہد اور لسانی دلائل کے درمیان الجھاؤ کی صورت کہیں کہیں پر مدہم اور مدغم نقش تلاشنے میں کامیاب ہے البتہ اردو کی شروعات پر مکمل اتفاق، علمی اور لسانی شواہد کا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بہر طور کھڑی بولی، برج بھاشا، پنجاب اور سندھ کے نکتہ نظر زیادہ مضبوط اور مدلل صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات References

صدیقی، خلیل (1989ء)، "زبان کا ارتقاء"، کوئٹہ، قلات پبلشرز، ص 12۔

Hall, Edward Twitchell (1990) “The hidden dimension”, New York, Knopf Doubleday Publishing Group, p-15.

Chomsky, Noam (2014), “Aspects of the Theory of Syntax”, Cambridge, MIT Press, p-10.

عبدالحق (1981ء)، "اردو صرف و نحو"، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ص 8۔

Saussure, Ferdinand de (2011), “Course in General Linguistics”, New York, Columbia University Press, p-34.

Crystal, David (2003), “The English Language: A Guided Tour of the Language”, New York, Penguin, p-51.

شاہین، ڈاکٹر امیر اللہ خاں (1987ء)، "جدید اردو لسانیات"، میرٹھ، چغتائی پبلشرز، ص 126۔

سبزواری، ڈاکٹر شوکت (1990ء)، "اردو لسانیات"، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ص 26۔

خاں، پروفیسر اقتدار حسین (1994)، "صوتیات اور فونیمیات"، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ص 11۔

Jackendoff, R (1990), “Semantic Structures”, Cambridge, MIT Press, p-1.

Lycan, W. G. (2000), “Philosophy of Language: A Contemporary Introduction”, London, Routledge, p-57.

عبدالحق (1981ء)، "اردو صرف و نحو"، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ص 9۔

جین، پروفیسر گیان چند (1985ء)، "عام لسانیات"، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، صف 10۔

صدیقی، خورشید حمرا (1993ء)، "اردو زبان کا آغاز: مختلف نظریات اور حقائق"، جموں، جموں یونیورسٹی، ص 9۔

جین،ڈاکٹر گیان چند(1979ء)،"لسانی مطالعے"، نئی دہلی، ترقی اردو بورڈ، ص213۔

References in Roman Script:

Siddiqui, khalil (1989),"Zabaan ka Irtiqa", Queta, Qalaat Publishers, p-12.
Hall, Edward Twitchell (1990) "The hidden dimension", New York, Knopf Doubleday Publishing Group, p-15.
Chomsky, Noam (2014), "Aspects of the Theory of Syntax", Cambridge, MIT Press, p-10.
Abdal-Haq (1981),"Urdu Sirf o Nahvo", Nai Dehli , Anjuman Taraqqi Urdu Hind, p-8.
Saussure, Ferdinand de (2011), "Course in General Linguistics", New York, Columbia University Press, p-34.
Crystal, David (2003), "The English Language: A Guided Tour of the Language", New York, Penguin, p-51.
Shaheen, Dr Ameer Allah Khan (1987),"Jadeed Urdu Lasaniat", Mirth, Chughtaee Publishers, p-126.
Sabzwari, Dr Shaukat (1990),"Urdu Lasaniat", Aligarh, Educational Buk House, p-26.
Khan, Professor Iqtidaar Hussain (1994),"Sotiyaat aur Phanonimiat", Nai Dehli , Taraqqi Urdu Beuro, p-11.
Jackendoff, R (1990), "Semantic Structures", Cambridge, MIT Press, p-1.
Lycan, W. G. (2000), "Philosophy of Language: A Contemporary Introduction", London, Routledge, p-57.
Abdal-Haq (1981),"Urdu Sirf o Nahvo", Nai Dehli , Anjuman Taraqqi Urdu Hind, p-9.
Jain, Professor Geyan Chand (1985),"Aam Lasaniat", Nai Dehli , Taraqqi Urdu Beuro, p-10 .
Siddiqui, Khurshid (1993),"Urdu Zabaan ka Aaghaz: Mukhtalif Nazriaat aur Haqayiq", Jammu, Jammu University, p-9.
Jain, Dr Geyan Chand (1979),"Lasani Mutalay", Nai Dehli , Taraqqi Urdu Board, p-213 .